ڈاکٹر سید زاہد علی واسطی

معرفتِ الٰہی طبّی نقطۂ فکر سے

یہ سوال اکثر ذہنوں میں ابھرتا ہے کہ انسان خدا کو کیسے دیکھ سکتا ہے ؟ واضح رہے کہ دیکھنے کے لیے ضروری ہے کوئی چیز خاص ہیئت ، مقام ، شکل اور رنگ میں سامنے موجود ہو۔ روشنی کی شعاعیں اس سے ٹکرا کر انسان کی آنکھ کے پردۂ بصارت پر پڑیں اور آنکھ سے ایک خاص نس کے ذریعے دماغ میں بینائی کے مرکز تک اس کی تصویر منتقل ہو جائے۔ کیا اللہ جل واعلیٰ کی ذات کے متعلق اس طرح قابلِ دید ہونے کا تصور کیا جا سکتا ہے ؟ ہرگز نہیں۔ اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ خدا کے وجود کو دیکھنے کی حقیقت کا عملی ظہور اس خاص صورت میں ہو سکتا ہے تو یہ اس کی نافہمی کی دلیل ہے۔ خدا کو خدا کی خدائی میں دیکھنے کی بے شمار صورتیں ممکن ہیں ، جن میں ہم خدا کی تجلی اور اس کا نور ، اس کا ظہور عملاً دیکھ سکتے ہیں :

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ط (النور : ۳۵)

اللہ تعالیٰ نور دینے والا ہے ، آسمانوں اور زمینوں کا۔ اس کی حالت ایسی ہے ، جیسے ایک طاق ہے اور اس میں ایک چراغ ہے۔

اس بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ ذاتِ خداوندی کا جلوہ کائنات کے ہر منظر میں جھلکتا ہے اور یہ سب مظاہر کلیتاً رہنمائے ذاتِ باری اور انسان کے لیے باعثِ ہدایت ہیں۔ لیکن یہ رہنمائی بھی اس صورت میں ممکن ہے کہ ادراکِ صفات کو شعورِ ذات کا وسیلہ قرار دے لیا جائے۔ اگر ان صفات کو مقصود بالذات کی حیثیت دے دی جائے تو یہی وسیلہ راستے کی رکاوٹ بن کر ذہنی پریشانی کا موجب بن جائے گا۔ یہ ارض و سما ، نباتات و جمادات ، غرض تمام کائنات کے نظر افروز مناظر کیا ہیں۔ یہ سب ذاتِ خداوندی کے پرتو ہی تو ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ط (النحل : ۱۸)

اگر تم اللہ کی نعمتیں گننی چاہو تو ان کا احاطہ نہ کر سکو گے۔

تخلیقِ انسان

بڑے بڑے سائنسدان اور اربابِ علم وصلاح جو صدیوں سائنسی تحقیقات کی بنیاد پر فلسفے کی تعمیر میں کوشاں رہے۔ بڑے بڑے ماہرین حیاتیات وارضیات جو تخلیق کے حکیمانہ اقدار اور مخلوقات کی معقولیت و موزونیت کے بارے میں غور وفکر کرتے رہے، اسی نتیجے پر پہنچے کہ کائنات کی تخلیق و قیام ایک زبردست ریاضیاتی استواری و توازن کی مرہونِ منت ہے۔ وہ یہ کہنے پر مجبور ہوگئے کہ دنیا کے کل کتب خانوں سے زیادہ حکمت کے خزانے خود انسان کے جسم کی ساخت اور عمل و اثر میں پوشیدہ ہیں۔

انسان کا ظہور کون و مکان کی تخلیق کا نقطۂ عروج ہی نہیں بلکہ منتہائے مقصود بھی ہے۔ اسی لیے تو اس کو خلیفۃ اللہ فی الارض قرار دیا گیا، اور اگر ہم تمام اسباب و علل کو سامنے رکھ کر انسان کو لطائف ایزدی کا مظہر کہیں تو بیجا نہ ہوگا۔ قرآن کی رو سے انسان کی خلقت روحانی اور جسمانی اعتبار سے احسن تقویم ہے۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ (التین ، ۴)

انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیے جانے کا مطلب یہ ہے کہ اس کو اعلیٰ درجے کا جسم عطا فرمایا گیا، جو کسی دوسری جاندار مخلوق کو نہیں دیا۔ اسے فکر و فہم اور علم و عقل کی وہ بلندیاں اور قابلیتیں بخشیں جو کسی مخلوق کو عطا نہیں کی گئیں۔

انسان اپنی زندگی مادی عناصر سے شروع کرتا ہے، اور پھر درجہ بدرجہ ترقی کرتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ حواس و عقل سے نوازا جاتا ہے۔ چنانچہ یہ اس قادرِ مطلق کی قدرت و حکمت ہے کہ انسان کی پیدائش مٹی سے شروع کی جس کے متعلق ارشادِ ربانی ہے:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِنْ حَمَإٍ مَسْنُونٍ ۚ (الحجر، ۲۶)

ہم نے انسان کو کھنکھناتی مٹی کے گارے سے پیدا کیا۔

قدیم یونانی اطبا و حکما کا خیال تھا کہ انسانی جسم چار عناصر (مٹی، پانی، آگ اور ہوا) سے مرکب ہے۔ عربوں نے بھی اس معاملے میں یونانی حکما کی اتباع کی اور انہی چار عناصر کو بنیادی حیثیت قرار دیا۔ اٹھارھویں صدی عیسوی کے آخری نصف تک یورپی سائنس دانوں نے مٹی اور پانی کو مرکب ثابت کرکے مادے کے آکسیجن ہائیڈروجن، نائٹروجن جیسے تقریباً اسّی عناصر کی تفصیل بتادی۔ انسانی جسم کے تجزیے سے بھی یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا کہ انہی عناصر میں سے ایک محدود تعداد جسم میں موجود ہے، جن میں سے خاص خاص عنصر

نٹروجن، آکسیجن، کاربن، ہائیڈروجن، کیلشیم، گندھک اور فاسفورس ہیں۔ ان کے علاوہ آئرن، میگنیز، زنک کوبالٹ اور کاپر وغیرہ بھی شامل ہیں۔ مذکورہ عناصر انسانی جسم میں ایسے سادہ اور خالص شکل میں دست یاب نہیں ہوتے بلکہ غذا کے دورانِ انہضام میں جسم کے اندر کیمیائی طریقے سے سادہ اجزا بنا دی جاتی ہیں، اور پھر ان سادہ اجزا کو اکٹھا کیا جاتا ہے، اور اکٹھا کر کے جزوِ بدن بنا دیا جاتا ہے۔ گویا ایک بسا فعل بروئے کار لایا جاتا ہے، جسے تجمع کا فعل کہا جاتا ہے۔ مثلاً جب کاربن ڈائی آکسائڈ دھوئیں اور دریا کی راکھ میں تبدیل ہو جاتی ہے تو توانائی پیدا ہوتی ہے۔ جسے عملِ تفرق کہتے ہیں۔ یہی شکست و ریخت کے عوامل ہر وقت جاری رہتے ہیں اور یہی تفرق حقیقت میں زندگی کا دوسرا نام ہے:

زندگی کیا ہے، عناصر کا ظہورِ ترتیب موت کیا ہے، انہی اجزا کا پریشاں ہونا

قرآن نے ربوبیت کے مظاہر اعمال کے استدلال کے ساتھ ساتھ کائنات و خلقت کے افادہ و فیضان، زینت و جمال، موزونیت و اعتدال کے حقائق کی راہنمائی بھی کی ہے، جس کے لیے فرمانِ الٰہی ہے:

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِیْدٌ ۝ (ق، ۳۷)

بلاشبہ اس میں بہت بڑی بصیرت ہے۔ اس کے لیے جو اپنے پہلو میں دل رکھتا ہو اور جس کے سر میں سننے والا کان ہو۔

دماغ

دماغِ انسانی کو کئی اعتبار سے تفوق حاصل ہے۔ اسے گنجینۂ اسرار کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ یہی دماغ نفسِ امارہ اور نفسِ لوامہ کے درمیان فیصلہ کن راہیں دکھاتا ہے، قدرت کا یہ شان دار آلہ اپنے بنیادی حیاتیاتی کردار کی بدولت ہمیں خارجی دنیا کے متوقع حادثات میں متوازن رکھتا ہے۔ جسمانی تندو تیز لامتناہی کیمیاوی اور احساساتی تبدیلیوں کے ماحول میں بھی اپنی ہستی کو برقرار رکھنے کی ذمہ واری بھی دماغ پر عائد ہوتی ہے۔ دماغ ہمارے ارادی افعال و عضلات کی حرکات و سکنات اور دیگر اعضا مثلاً دل، پھیپھڑے، جگر، معدہ، گردے اور غدودوں وغیرہ کے کاموں میں ربط و ضبط، انضمام و انصرام اور اشتراکِ عمل پیدا کرتا ہے۔

آئیے آپ کو دماغ کی سیر کرائیں۔ اس کا وزن تقریباً ایک کلوگرام ہوتا ہے۔ یہ متعدد جھلیوں میں بند انسان کی کھوپڑی میں بہ حفاظت رکھا ہوا ہے لیکن خدائے ذوالجلال کے شاہ کار عصبی نظام کے ذریعہ سے اس کا رابطہ جسم کے ایک ایک خلیہ سے ہوتا ہے۔ دماغی مادہ نہایت چھوٹے چھوٹے عصبوں پر مشتمل ہے جنھیں نیورونز کہتے ہیں۔ ان کی تعداد ایک محتاط اندازے کے مطابق تیرہ ارب پچاس کروڑ کے لگ بھگ ہے۔ کارکردگی کے

حافظے سے نیورون اطلاعات کی وصولی، رسائی اور روانگی کے مرکز ہیں، جہاں سے ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں خودکار افعال انجام پاتے ہیں۔ مثلاً نظامِ انہضام، تنفس اور دورانِ خون کی کارکردگی اس حصے کے ماتحت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کو ارتقا پذیر کہا جاتا ہے۔ چونکہ یہی حصہ انسان اور حیوان میں تفریق پیدا کرتا ہے اور اس کے اندر بدن کے مختلف حصوں مثلاً ٹانگوں، ہاتھوں، بازوؤں حتیٰ کہ ایک ایک عضو کے مختلف مراکز کے علاوہ سونگھنے، چکھنے، دیکھنے، سننے، سوچنے کے مراکز موجود ہوتے ہیں اور یہیں سے جسم کے تمام حصوں کے مختلف النوع کاموں پر کنٹرول ہوتا ہے۔ جسم کے وسیع و عریض مواصلاتی نظام میں اربوں عصبے انتہائی برق رفتاری سے ہر لمحہ اپنے مخصوص مراکز کی معرفت کام انجام دیتے رہتے ہیں۔ کنپٹیوں کے قریب دماغ میں یادداشت کا ایک مرکز ہے۔ مرگی اور دوسرے امراض میں یہ مرکز اثر انداز ہوتا ہے، جس سے گزشتہ واقعات کی یادداشت متاثر ہو جاتی ہے۔ پچھلے حصے میں بصارت کا مرکز ہے۔ اسی طرح سماعت کا مرکز ہے۔ اکثر اوقات بالائی دماغ کی صلاحیتیں کمزور ہو جاتی ہیں۔ دماغی کام کرنے کی سکت، اوصاف اور خصوصیات کم ہونے لگتی ہیں۔ یہ علامات دماغ کی شریانیں سکڑنے کی بیماری یا درازیٔ عمر کی وجوہ سے پیدا ہوتی ہیں۔

دماغ کی نچلی سطح پر ایک گول مٹول مٹر کے دانے کے برابر ایک محیر العقول غدود ہے، جو بہ حفاظت ایک غلاف میں محفوظ ہے۔ اس غدود کو پی ٹوی ٹری کہتے ہیں۔ یہ عجائبِ قدرتِ الٰہی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ انسان کے جسم میں تمام غدودوں سے یہ نسبتاً سب سے چھوٹا غدود ہے۔ مگر اس میں اللہ تعالیٰ نے وہ جوہر پنہاں رکھے ہیں، جن سے انسانی ہیئت اور جسم کی تمام نشو و نما کا کنٹرول اسی غدود کی کارکردگی کا محتاج ہے۔ اس غدود کا فعل ناقص ہو تو آدمی کا قد بہت چھوٹا رہ جاتا ہے۔ عموماً ڈھائی تین فٹ تک بڑھ سکتا ہے اور بتدریج نشو و نما رک جاتی ہے۔ جسمانی کمی کے ساتھ ساتھ انسان ذہنی طور پر بھی عموماً انحطاط کا شکار ہو جاتا ہے۔ اور اگر یہ غدود بڑھ جائے تو اس کی کارکردگی انسانی جسم میں ایک تغیرِ عظیم کا موجب بن جاتی ہے۔ انسان ایک عظیم الجثہ شخصیت میں بدل جاتا ہے۔ قد سات آٹھ فٹ تک بڑھ جاتا ہے۔ بازو اور ٹانگوں میں کوئی توازن و تناسب نہیں رہتا۔ چہرہ لمبوترا اور دھڑ بیلے ڈول ہو جاتا ہے۔ دودھ پیدا کرنے پر اور عمل توالد پر بھی اس کا اثر حیرت انگیز طور پر پڑتا ہے۔ غدود کے پچھلے حصے کی رطوبت، دورانِ خون میں شامل ہو کر بے قنات غدودوں کے رس میں مل جاتی اور بلڈ پریشر اور آنتوں کی حرکت کو درست حالت میں رکھتی ہے۔ مزید برآں اس کی رطوبتیں دوسرے غدودوں کی کارکردگی کو کنٹرول

کرتی ہیں۔ اس غدود کو اس لحاظ سے جسم کے تمام غدودوں کا ہیڈ ماسٹر بھی کہتے ہیں۔

زبان

زبان اگرچہ اللہ تعالیٰ نے ہر مخلوق کو دی ہے۔ مگر انسان کو اشرف بنانے کے لیے رب العالمین کی نوازش ہے کہ قوتِ گویائی عطا فرمائی۔ زبان کا ذکر سورۃ البلد میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے انسان کو زبان عطا کی ہے۔ مگر یہ صرف بولنے کا آلہ نہیں ہے۔ بولنے والی زبانیں تو چرند پرند، ہر ایک کو مرحمت فرمائی گئی ہیں۔ مگر انسان کے لیے یہ نفس ناطقہ ہے جو کہ اظہار مافی الضمیر کا ذریعہ ہے۔ جس سے انسان کو دیگر مخلوق پر فوقیت حاصل ہے۔ سورہ الرحمٰن میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے : عَلَّمَهُ الْبَيَانَ۔ انسان کو اس نے بولنا سکھایا۔ یعنی ہمارا بولنا رب کریم کا فیض بے بہا ہے۔ اس قوتِ گویائی کے علاوہ اللہ نے زبان میں کس قدر خوبیاں عطا فرمائیں۔ آیئے دیکھیں عطیہ زبان میں کیا اسرار مضمر ہیں۔

زبان کی بناوٹ کلیتہً عضلاتی بافتوں کی مرہونِ منت ہے۔ اسی لیے ہم اس کو اپنی مرضی کے مطابق جس سمت چاہیں گھما پھرا سکتے ہیں۔ زبان کی اوپر کی تہہ لعاب دار جھلی کی بنی ہوئی ہے۔ اس میں بے شمار چھوٹے چھوٹے ابھار ہیں، جن کی تعداد کئی لاکھ ہے۔ انھیں ذائقے کے ابھار کہتے ہیں۔ ان تمام ابھاروں کے جوف میں خلیوں کے ایسے مجموعے ہیں جو ذائقے کی حس رکھتے ہیں۔ یہ مختلف ذائقوں کے شگوفے ہیں۔ کوئی چیز اگر سیال حالت میں نہ ہو تو ذائقے کے شگوفے متاثر نہیں ہوتے۔ اگر وہ چیز پہلے ہی سیال حالت میں نہ ہو تو لعابِ دہن اس کو محلول بنا دیتا ہے۔ اگر زبان پر سے لعاب بالکل صاف کر دیا جائے اور زبان پر نمک یا شکر رکھ دی جائے تو وہ کوئی ذائقہ پیدا نہیں کرے گی۔ اگرچہ کھانے سیکڑوں اقسام کے ہوتے ہیں اور ہر ایک کھانے کا ذائقہ انفرادی نوعیت کا ہوتا ہے۔ لیکن بنیادی ذائقے صرف چار ہیں — میٹھا، نمکین، کڑوا اور کھٹا۔ ان ذائقوں میں میٹھے اور نمکین ذائقوں کو زبان کا سرا بہت اچھی طرح محسوس کرتا ہے۔ کڑوا ذائقہ زبان کے پچھلے سرے میں محسوس ہوتا ہے اور کھٹے ذائقے کی حس صرف زبان کے کنارے محسوس کرتے ہیں۔ یہ بھی نیرنگی قدرت ہے کہ ذائقے کی حس کا سونگھنے کی حس سے بہت قریبی تعلق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی بد ذائقہ دوا مثلاً کسٹرائیل وغیرہ پینا پڑ جائے تو ناک بند کر کے پی جاتی ہے، اور اسی لیے نزلے زکام میں کھانوں کے ذائقے محسوس نہیں ہوتے اور لذت کم ہو جاتی ہے۔ مثلاً ہم کو اصل اور جعلی ونیلا پیش کی جائے، ہم کا ہم جو اچھا ذائقہ تصور کرتے ہیں، وہ دراصل اس کی اچھی خوشبو ہوتی ہے۔ جو جعلی ذائقے کے باوجود اپنا

مخصوص اثر پیدا کرتی ہے۔ اب ذرا سوچیے کہ صرف چار انچ کے گوشت کے اس لوتھڑے میں اس قدر خوبیاں علاوہ اس خالقِ کائنات کے کوئی اور پیدا کر سکتا ہے؟ ہرگز نہیں!۔

آنکھ

ذرا غور تو فرمایئے خالقِ کائنات کی حکمت عملیوں پر کہ حیات کی نمود میں آنکھ کی تخلیق، پھر اس میں بصارت و مناسبت اور مطابقت و موزونیت کا بے پایاں کمال جس کی تحسین طاقتِ انسانی سے باہر ہے۔ ایک لمحے کے لیے تصور فرمائیں کہ اگر آنکھیں دو کی جگہ ایک ہوتی یا اپنی موجودہ جگہ کے بجائے سینے یا پشت پر ہوتیں تو انسان کی ہیئت کیا ہوتی۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

اِنَّا کُلَّ شَیْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ ط

یعنی ہم نے جتنی چیزیں پیدا کیں ایک اندازے کے ساتھ پیدا کیں۔

اب میں آپ کو اسی پُر اسرار عطیہ ربانی کی سیر کراتا ہوں۔

آنکھ عجائبات قدرتِ الٰہی میں سے ایک عظیم عطیہ ہے، جس کی حفاظت کے لیے قدرت نے سر کی ہڈیوں میں ایک جوف بنایا ہے، جسے خانہ چشم کہتے ہیں۔ اس خانہ چشم کے اطراف کی ہڈیاں سوائے سامنے کے رخ کے ہر طرف سے آنکھ کی حفاظت کرتی ہیں۔ سامنے کے رخ آنکھ کی حفاظت پپوٹے کرتے ہیں۔ ان پپوٹوں کے اندر بے شمار غدود ہیں، جن سے لعاب دار رطوبت خارج ہوتی رہتی ہے۔ یہ رطوبت آنکھ کی سطح کو چکنا رکھتی ہے، اور اس کی وجہ سے آنکھ بآسانی حرکت کرتی رہتی ہے۔ ان پپوٹوں کے سروں پر لمبے لمبے بال ہیں، جنھیں پلکیں کہتے ہیں۔ یہ پلکیں آنکھ کو ٹھوس و رقیق ہر قسم کے بیرونی مادوں کی زد سے محفوظ رکھتی ہیں۔

آنکھ میں چھ عضلات ہیں، جن کی مدد سے آنکھ کو ہم ہر جانب اپنی مرضی سے گھما سکتے ہیں۔ آنکھ کا دماغ کے ساتھ تعلق ایک عصب کے ساتھ ہوتا ہے، جسے عصبِ باصرہ کہتے ہیں۔ آنکھ کے کئی بیرونی پردے ہیں، جن کے علاوہ ایک سب سے اندرونی پردہ ہے۔ جسے پردۂ شبکیہ یا (ریٹینا) کہتے ہیں۔ یہ پردہ عصب باصرہ کے آخری سرے پر واقع ہے۔ شبکیے کی تمام سطح یکساں طور پر روشنی کا اثر قبول نہیں کرتی۔ آنکھ میں بیرونی پردے کے درمیان ایک شیشہ (لینس) ہوتا ہے۔ یہ ایک شفاف جھلی میں ملفوف ہے۔ شیشہ ساخت کے لحاظ سے محدب ہے۔ شیشے کے باہر کے پردے شیشے کی موٹائی کو گھٹاتے بڑھاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے اس کا طول ماسکہ علی الترتیب کم یا زیادہ ہوتا ہے۔ اس عمل کو تطبیق کہتے ہیں۔ اس کی وجہ سے ہم دور و نزدیک کے فاصلوں

یزوں کو صاف فوکس میں لا کر دیکھ سکتے ہیں۔ جب روشنی شیشے میں سے گزرتی ہے تو وہ انعطاف سے رکز پر جمع ہو جاتی ہے، اور پردۂ بصارت پر اس چیز کی تصویر نمایاں ہو جاتی ہے، جہاں سے عصبِ کے ذریعے یہ دماغ میں احساسِ بینائی پیدا کرتی ہے۔ پردۂ چشم پر جو عکس پڑتے ہیں، وہ سیکنڈ کے یں حصّہ تک قائم رہتے ہیں اور آنکھوں کی تا دیر بینائی کے تاثر کو قائم رکھنے کے اصول پر سینما کی طرح تصویریں ہتی ہیں۔

آنکھیں تو گدھے، گھوڑے کو بھی عطا کی گئی ہیں۔ مگر انسان کی آنکھ اس کائنات کو دیکھ کر اسے فکرو رعلم و عقل کی گرفت میں لاتی اور بے شمار عظیم الشان کام انجام دینے کا باعث بنتی ہے۔ اور پھر دیگر فات کی آنکھوں سے کام لینے کا ذریعہ بھی ثابت ہوتی ہے۔ قرآنِ پاک میں ہے:

اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ (البلد - ۱۰)۔ (کیا ہم نے انسان کو دو آنکھیں نہیں دیں)۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ (الملک: ۳۲)۔ پھر ایک جگہ ارشاد ہے:

(وہ وہ خدا ہی تو ہے، جس نے تمہیں پیدا کیا اور تم کو کان اور آنکھیں عطا کیں۔

یوں تو جسم کا ہر خلیہ عظمتِ تخلیق کا مظہر ہے۔ مگر دل کی کارفرمائی یہ ہے کہ وہ کل جسم کی شیرازہ بندی اور زندگی کے ظہور کو اپنے عمل و تدبیرِ خاص سے قائم رکھتا ہے اور خالقِ عظیم سے کے حکیمانہ حکم سے ایک وقتِ معینہ تک مصروفِ کار رہتا ہے۔ انسانی ہاتھ اس کی نقل سے قطعی عاجز ہے۔

دل کہنے کو تو ایک قسم کا پمپ ہے جس کا کام الفاظ میں تو بہت معمولی نوعیت کا ہے۔ یعنی ایک طرف سے خون لے کر دوسرے راستے سے جسم کے مختلف حصّوں میں روانہ کر دینا۔ مگر یہ ایک ایسا عجوبۂ تخلیق ہے کہ آج تک کوئی مشین اس مختصر سائز میں یہ کام نہ کر سکی اور نہ کر سکے گی۔ یہ پھیپھڑوں کے درمیان واقع ہے، اور ایک مخروطی شکل کا کھوکھلا عضو ہے۔ ایک دو تہوں والی جھلی کے تھیلے میں ملفوف ہے، غلاف رطوبت سے بھرا ہوا ہے۔ اس میں بیک وقت ۷۰ مکعب سنٹی میٹر خون سما سکتا ہے۔ دل میں صرف چار خانے ہیں۔

دل کے خانوں میں خون کی آمد و رفت کے لیے دائیں اور بائیں حصّوں کے درمیان سوراخ ہیں۔ اسی طرح بالائی اور زیریں حصوں کے درمیان بھی سوراخ ہیں۔ ان سوراخوں کے درمیان ایسے والو لگے ہوتے ہیں، جو خون کی یک طرفہ آمد و رفت کا انصرام کرتے ہیں۔ یہ مظاہرِ ربانی دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ دل ہی ان خواہشاتِ نفسانی

کی آماج گاہ ہے، جہاں اخلاقیات، دیانت، امانت، شرافت وشائستگی، انصاف ورحم، محبت وہمدردی جیسے فضائل اور رذالت وسفلہ پن، ظلم وستم، شرک والحاد، گمراہی وضلالت کی اتھاہ گہرائیوں میں چلنے کے منصوبے بنتے ہیں۔ مگر عام محسوسات میں یہ نظر نہیں آتے۔ دوران خون کی ابتدا میں شریانوں کے ذریعے ناخالص خون پھیپھڑوں میں عروق شعریہ کے درمیان سے جب گزرتا ہے تو سانس کے ساتھ وہاں آئی ہوئی آکسیجن کے ذریعے صاف ہو جاتا ہے اور یہ شفاخون پھر ایک ورید کے ذریعے دل میں داخل ہو جاتا ہے۔ جہاں سے شریانِ اعظم کی شاخوں کے ذریعے جسم کے تمام حصوں میں جا پہنچتا ہے۔ شریانیں شاخ در شاخوں میں تبدیل ہو کر بہت باریک شریانوں میں منقسم ہو جاتی ہیں۔ جنھیں شریانیں کہتے ہیں۔ یہ شریانیں مزید تقسیم ہو کر بال سے باریک ایسی بے شمار نالیوں میں بٹ جاتی ہیں، جنھیں عروق شعریہ کہتے ہیں۔ عروق شعریہ اس قدر باریک ہیں کہ ہم انھیں خوردبین کے علاوہ قطعاً نہیں دیکھ سکتے۔ انھیں عروق شعریہ کے ذریعے جسمانی بافتوں اور خون کے درمیان غذائی مادوں اور گیسوں کا اہم تبادلہ ہوتا ہے۔ اس تبادلے کے بعد عروق شعریہ آپس میں مل کر پھر ذرا بڑی نالیوں میں بدل جاتی ہیں، جنھیں ورید کہتے ہیں۔ یہ وریدیں مل کر بڑی نالیوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں اور آخر میں تمام وریدیں دو بڑی وریدوں میں ختم ہو جاتی ہیں۔ یہ دونوں بالائی اور زیریں ورید اعظم میں کھلتی ہیں۔ جہاں سے یہ تمام آلودہ گندہ خون پھیپھڑوں میں لے جا کر نظام دورانِ خون قائم رکھتی ہیں۔ اگر تمام خون کی نالیوں کو ایک لمبائی میں رکھا جائے اور ان پر سفر کیا جائے تو آپ بآسانی لاہور سے ملتان پہنچ سکتے ہیں۔

نبض کی حرکت دل کی دھڑکن کے مطابق ہوتی ہے۔ ایک منٹ میں دل اوسطاً ۷۲ مرتبہ دھڑکتا ہے۔ مگر جسمانی مشقت اور بخار میں دل کی دھڑکن بڑھ جاتی ہے۔ اسی لیے نبض کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔ دل اور نبض کی رفتار میں گردشِ خونِ اور خون کے بہت سے افکار کارفرما ہیں۔

یہاں خون کے بارے میں کچھ بتا دینا بھی ضروری ہے۔ خون تخلیق کائنات کا ایک اہم ترین ہے۔ یہ جسم کے وزن کا تقریباً بارھواں حصہ ہوتا ہے۔ اگر خون کے قطرے کو خوردبین میں دیکھیں تو لاتعداد گول گول جسمیے بے رنگ سیال میں تیرتے نظر آئیں گے۔ یہ جسمیے سُرخ وسفید رنگ کے ہوتے ہیں۔ خون کے ایک قطرے میں تقریباً پچاس لاکھ سے زائد جسمیے ہوتے ہیں۔ ان کا کام جسم کو طاقت پہنچانا اور آکسیجن کو جذب کر کے جسم کے تمام حصوں کو فراہم کرنا ہے، جس کی وجہ سے جسم میں توانائی آجاتی ہے۔ آپ نے مشاہدہ کیا ہوگا کہ کسی حادثے میں خون کی کثیر مقدار کے ضائع ہونے سے موت واقع ہو جاتی ہے۔ حقیقت میں انہی سُرخ ذرات کی کمیابی ہو جاتی ہے،

جس کی وجہ سے توانائی اس حد تک کم ہو جاتی ہے کہ موت ناگزیر ہو جاتی ہے۔

گُردے

دیکھنے میں تو گردے ایک حقیر سی چیز معلوم ہوتے ہیں۔ مگر قادرِ مطلق اور علیم و حکیم کی صناعی کا لافانی شاہکار ہیں۔ ان کی کارکردگی مظاہرِ ربِ کریم کے کمالات و عجائبات میں سرِفہرست ہے۔ گو آج انسان نے بکمال تحقیق مصنوعی گردے بنانے میں قدرے کامیابی حاصل کر لی ہے، مگر اگر کسی نے اس مصنوعی گردے کو کبھی دیکھا ہو تو اندازہ کر سکے گا کہ پندرہ مربع فٹ کے مصنوعی گردے اور چار مربع انچ کے گردہ میں نہ صرف سائز میں فرق ہے، بلکہ مصنوعی گردے کی جزوقتی کارکردگی کے مقابلے میں بھی زمین و آسمان کا فرق ہے۔

بہرحال گردوں کی جوڑی جوفِ شکم کے اندر ریڑھ کی ہڈی کے دائیں بائیں ہوتی ہے۔ اگر گردے کو لمبائی میں چیر کر دیکھا جائے تو اس کے اندر دو تہیں نظر آتی ہیں۔ بیرونی تہہ کو کارٹیکس اور اندرونی تہہ کو میڈلا کہتے ہیں۔ میڈلا سے مثانے تک ایک لمبی پتلی نالی پیشاب لے جانے کے کام آتی ہے۔ کارٹیکس کے درمیان خالی جگہیں نظر آتی ہیں۔ ان خالی جگہوں میں مخروطی سطحیں ہوتی ہیں۔ اگر کسی مخروط کو کاٹا جائے تو اس میں بے شمار خمیدہ نالیاں نظر آئیں گی۔ ان کا خاص وصف یہ ہے کہ وہ خون سے بے کار مادے جذب کر کے انھیں خالی جگہوں میں جہاں مخروطے ہوتے ہیں، لا ڈالتی ہیں۔ یہ نالیاں گردے کی بیرونی سطحوں کے قریب آ کر پھیل جاتی ہیں اور کُروں کی شکل اختیار کر لیتی ہیں اور یہاں عروقِ شعریہ کے گچھے بنا لیتی ہیں۔ یہ کُرے گردوں کی مشینری کی بنیادی اکائی ہیں۔ گردے کے اندر تقریباً دس لاکھ سے زائد نیفرون یا کُرے ہوتے ہیں۔ ہر نیفرون ایک مکمل مشینری ہے، جس میں مختلف قسم کے کل پرزے ہوتے ہیں۔ اس میں ایک باریک نالی ہے جس کی لمبائی تین سنٹی میٹر ہے۔ اس طرح اگر دونوں گردوں میں ان نالیوں کی لمبائی ناپ لی جائے تو چالیس میل سے زائد بنتی ہے۔ گردوں کی کارکردگی اگر دیکھی جائے تو انسان حیران رہ جاتا ہے۔

گُردوں میں تیرہ سو مکعب سنٹی میٹر خون فی منٹ کے حساب سے گردش کرتا ہے۔ اس گردش کا مقصد خون کا ان باریک نالیوں کے گچھوں سے گزرنا ہوتا ہے، جہاں سے خون کے فاسد مادوں کا اخراج پیشاب کے ذریعے ہوتا ہے۔ اس طرح چوبیس گھنٹوں میں اوسطاً ۱۷۰ لیٹر خون گردوں میں سے گزر جاتا ہے۔ گردوں کی بیماریوں میں بنیادی اکائی اثر انداز ہوتی ہے، جس کی وجہ سے خون کے ذرات اور چند ضروری اشیا مثلاً شکر اور حربی وغیرہ پیشاب کے ذریعے خارج ہونا شروع ہو جاتی ہیں اور

فاسد مادے مثلاً یوریا، یورک ایسڈ اور متعدد نمکیات جو خارج ہونا ضروری ہوتے ہیں، دوبارہ خون میں واپس چلے جاتے ہیں۔

خوراک

اکثر مشینوں میں کسی زمانے میں لکڑی، پتھر کا ایندھن جلاتے تھے، جس کے جلنے سے توانائی حاصل ہوتی ہے۔ اس کے بعد تیل سے بتدریج ترقی ہوتے ہوتے آج کل گیس، بجلی اور شمسی شعاعوں کا ایندھن جلنے لگا ہے۔ ہمارے جسم میں بعینہٖ ایندھن جلایا جاتا ہے تاکہ ہمیں توانائی حاصل ہو اور یہ ایندھن خوراک ہے۔ خدا تعالیٰ نے ہمیں اعلیٰ درجے کی خوراکوں سے نوازا ہے جس کو بطور ایندھن ہم پیٹ کی بھٹی میں جھونک دیتے ہیں۔ جس طرح مشین کے کل پرزے گھستے رہتے ہیں، اسی طرح ہمارے جسم کی بھٹی کی بھی کام کرنے سے شکست و ریخت ہوتی رہتی ہے

ہمارے جسم کو توانائی پیدا کرنے کے لیے کاربوہائیڈریٹ، پروٹین اور چکنائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو ہمیں قوت فراہم کرتے ہیں۔ بچوں میں تازہ بافتیں بناتے ہیں۔ بڑی عمر میں شکستہ بافتوں کی مرمت کرتے ہیں۔ نمک اور حیاتین اگرچہ براہِ راست جسم میں کوئی خاص قوت مہیا نہیں کرتے مگر ان کی موجودگی بہت سے عوامل اور تبدیلیوں کے لیے ناگزیر ہے، جو کہ ہمارے جسم میں ہر لمحہ ہوتی رہتی ہیں۔ یہ سب اللہ کی الوہیت اور اس کی ربوبیت کا کرشمہ ہے، اور اس پر غور کریں تو معرفتِ الٰہی کا عمدہ ترین ذریعہ بنتے ہیں۔

مجمع البحرین (شیعہ سنی متفق علیہ احادیث)

مولانا شاہ محمد جعفر پھلواروی

یہ کتاب وحدتِ اُمت کی طرف ایک اہم قدم ہے۔ اس میں وہ احادیث و روایات جمع کی گئی ہیں، جو شیعہ اور اہلِ سنت کے درمیان متفق علیہ حیثیت رکھتی ہیں۔ شروع میں علامہ مفتی جعفر حسین مجتہد کا تعارف و تبصرہ اور علامہ نصیر الاجتہادی کی تقریظ ہے۔

صفحات: ۲۸+۲۲۲ قیمت: ۷/۰۰ روپے

ملنے کا پتا: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور